مستعار الفاظ: نوآبادیاتی تناظر

Loan words: Colonial Perspective

کوثر پروین [1]

Abstract:

Languages emerge under social needs. In multilingual societies, people exchange the words of different languages for communication. In this way, the words of a language enter into other language. It not only creates lingual harmony among the members of the society, but it also extends the sphere of language with the loan words. When the words of a language enter into the other language under political, social, economic and cultural needs, they are called borrowed or loan words. The domain of Urdu extended as a result of addition of words from other languages. The purpose of this article is to throw light on the economic, social and cultural causes and motives of the loan words from other languages in general and English language in particular.

Keywords: loan words, social needs, lingual harmony, multilingual societies, communication

کلیدی الفاظ: مستعار الفاظ، سماجی تقاضے، لسانی ہم آہنگی، کثیر اللسان معاشرے، ربط باہم

انسان کو حیوان ناطق کہا جاتا ہے۔ یہ اس کی قوت گویائی ہی ہے جو اسے اشرف المخلوقات کے درجے پر فائز کرتی ہے۔ یہ قوت گفتار ہے جو انسان کو دوسرے تمام جانداروں سے ممیّز و ممتاز کرتی ہے۔ بولنے کے لیے انسان جس طاقتور ہتھیار کا استعمال کرتا ہے وہ زبان ہے۔ مانا کہ بعض اوقات مختلف جذبوں کا اظہار صرف آنکھوں کے اشاروں یا چہرے کے تاثرات سے بھی کیا جا سکتا ہے لیکن انسان کے سبھی خیالات و جذبات کا اظہار محض اشاروں میں کرنا ممکن نہیں۔ زبان ہی ہے جو ہمیں ایک دوسرے کے احساسات و تجربات سے آگاہ کرتی ہے۔ سننا، دیکھنا اور محسوس کرنا انسان کے فطری اعمال ہیں کیونکہ کوئی بھی ہمیں آنکھوں سے دیکھنا یا کانوں سے سننا نہیں سکھاتا۔ لیکن زبان کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ بولنا ایک وہبی نہیں بلکہ اکتسابی عمل ہے زبان سیکھنے سے ہی آتی ہے پھر ہر شخص کی اپنی انفرادیت بھی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر بولنے والے کا لہجہ، لفظوں کا استعمال اور جملوں کی بناوٹ دوسروں سے مختلف ہوتی ہے:

---

[1] اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، گورنمنٹ ولایت حسین اسلامیہ کالج، ملتان

''زبان اکتسابی روایت ہوتی ہے، اکتساب کے دوران اس میں تصرفات کے تھوڑے بہت امکانات بھی ہوتے ہیں۔ اسے مخصوص غرض وغایت کے لیے وسیلہ بنایا جاتا ہے۔ سماجی اور تہذیبی محرکات اس میں تبدیلیاں بھی کر دیتے ہیں، ہر چند خفیف ہی سہی۔''[۱]

زبانیں سماجی ضرورتوں کے تحت وجود میں آتی ہیں۔ جب تک کوئی زبان ان ضرورتوں کو پورا کرتی ہے وہ زندہ رہتی ہے اور جب اس میں یہ صلاحیت باقی نہیں رہتی تو وہ مر جاتی ہے جیسے سنسکرت یا لاطینی۔ کسی بھی زبان کے الفاظ بدلتے ہوئے حالات کے تحت بدلتے رہتے ہیں۔ یہ تبدیلیاں اتنی فطری اور عمومی تقاضوں کے تحت وجود میں آتی ہیں کہ بولنے والوں کو ان کا شعور نہیں ہوتا یوں اس زبان کے بولنے والوں کا ایک بڑا حصہ ان تبدیلیوں کو قبول کرتا چلا جاتا ہے اور ان میں یکسانیت پیدا ہوتی رہتی ہے۔ یہ کبھی نہیں ہوتا کہ یکساں روی کی روح کے خلاف کوئی فرد اپنی مرضی سے زبان میں تبدیلی پیدا کرے یا اس میں اپنی مرضی کے الفاظ داخل کرے۔

انسانی معاملات میں جب مفاہمت پیدا ہوتی ہے یا انسانوں نے جب بھی ایک دوسرے کے ساتھ اتفاق کیا تو ہمیشہ زبان کے ذریعے سے کیا۔ جب بھی بات چیت کا سلسلہ شروع ہوا تو الفاظ کے ذریعے ہی ممکن ہوا۔ انسانوں کے درمیان اگر لسانی عمل نہ ہوتا تو اس کی گروہی اور عمومی جبلت کبھی پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکتی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان ایک دوسرے کے درمیان ربط پیدا کرنے کے لیے متعدد طریقے اختیار کرتا ہے مثلاً مل بیٹھ کر کھاتا ہے، باہمی دلچسپی کے کھیلوں میں شرکت کرتا ہے، ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کرتا ہے لیکن گفتگو یا تکلم ربط باہمی کا سب سے آسان اور سہل طریقہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پتھر اور دھات کے انسان نے ایک دوسرے سے معاونت کے لیے زبان ایجاد کی اور اسی زینے کے سہارے وہ دوسرے جانداروں سے آگے نکل گیا۔ روزمرہ کی بول چال میں ہم خیالی اور ہم آہنگی سماجی زندگی کا اہم اور بنیادی جزو ہے۔ اس ہم خیالی اور ہم آہنگی میں ہمیشہ ایک اصول کارفرما نظر آتا ہے کہ گفتگو کے دوران ربط باہمی پیدا کرنے کے لیے شرکائے بحث ہمیشہ ایسا موضوع اختیار کرتے ہیں جس میں ایک دوسرے سے اتفاق ممکن ہو۔ یہی اتفاق انسانی

یک جائیت اور مفاہمت کا باعث بنتا ہے اور اسی کی بدولت ایک دوسرے کی کیفیات اور ارادت سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

ایک زبان پر دوسری زبان یا زبانوں کا اثر ناگزیر ہوتا ہے۔ یہ اثر کچھ تو زبانوں کے نسبی اور لسانی تعلق کا نتیجہ ہوتا ہے اور بعض اوقات دو قوموں یا مختلف اللسان گروہوں کے باہمی تعلق اور اختلاط کا فیض بھی ہوتا ہے۔ جس طرح سب انسان حضرت آدم کی اولاد ہیں اور اس رشتہ سے ان میں فطری تعلق اور لگاؤ ہے اسی طرح ماہرین لسانیات کی تحقیق کے بعد اب یہ بات ڈھکی چھپی نہیں رہی کہ دنیا کی اکثر بولیاں اور زبانیں کسی نہ کسی لسانی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں جو جغرافیائی حالات اور دنیا کی وسعت کے ساتھ ساتھ مختلف شاخوں میں تقسیم ہوتی گئیں اور ہزارہا قسم کی زبانیں وجود میں آگئیں چناں چہ دنیا کی مختلف اور دور افتادہ زبانوں میں، جن کے درمیان طویل جغرافیائی فاصلے حائل ہیں، بیک وقت ایسے الفاظ ملتے ہیں جن کا منبع اور ماخذ ایک ہے حالانکہ علاقائی بُعد کی وجہ سے بعض زبانوں میں بظاہر دور کا واسطہ نہیں مثلاً سنسکرت کا لفظ ماتر فارسی میں مادر، انگریزی میں مدر، یونانی میں ماتیر، لاطینی میں ماترا اور روسی میں مات ہے۔ ایسے بہت سے الفاظ ہیں جو دنیا کی مختلف زبانوں میں خفیف صوری و صوتی تغیر کے ساتھ مستعمل ہیں۔

ایک زبان یا زبانوں پر دوسری زبان یا زبانوں کے اثرات زیادہ تر سیاسی حالات کے تحت رونما ہوتے ہیں اور یہ اثرات بالعموم زیادہ دیرپا ہوتے ہیں مثلاً عربوں کے حملوں نے مصر کی اصلی زبان کو اس قدر مسخ کر دیا کہ آج تمام مصر کی زبان عربی ہے۔ عربوں کی یورش نے اسی طرح ایران کی زبان کو بھی متاثر کیا۔ اسلامی فتوحات کے بعد ایرانیوں نے نہ صرف اپنا قدیم رسم الخط بدل دیا بلکہ ہزاروں عربی الفاظ اپنی زبان میں داخل کر لیے۔ سیاسی عوامل نے دنیا کی کئی زبانوں کو جنم دیا ہے۔ خود اردو انہی زبانوں میں شامل ہے۔ عربی فارسی کے اثرات سے قطع نظر جو اردو کے خمیر میں شامل ہیں اور جن سے اس کا وجود مستحکم ہے، اردو پر انگریزی کے اثرات بھی نمایاں ہیں۔ یہ اثرات تمام تر سیاسی حالات کا نتیجہ ہیں۔ تقریباً یہی صورتحال دنیا کی اکثر بڑی زبانوں کے ساتھ پیش آچکی ہے جو مختلف علاقوں اور لسانی گروہوں میں رابطے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ انگریزی کی پیدائش اور وسعت نارمن اور فرانسیسی فتوحات کا نتیجہ ہے۔ بات یہ ہے کہ دنیا کی کوئی زبان الگ تھلگ نہیں رہ

سکتی،اس کی ترقی اور نشوو نما کادارو مدار دوسری زبان یا زبانوں کے مابین الفاظ کے لین دین پر ہوتا ہے۔اگروہ ایسا کرنے سے گریز کرتی ہے تو وہ الفاظ کی کمی کا شکار ہو جاتی ہے اور دوسری زبانوں سے کٹ کر مردہ ہو جاتی ہے۔ ویدک، سنسکرت اور لاطینی زبانوں کی مثال تاریخ میں موجود ہے۔آج کے ترقی یافتہ دور میں چونکہ دنیا کے مابین فاصلے کم ہوتے جارہے ہیں اور دنیا گلوبل ویلیج بن گئی ہے، نت نئے نظریات اور سائنسی ایجادات نے دنیا کی زبانوں اور قوموں کو ایک دوسرے کے ساتھ ربط ضبط کا متقاضی بنادیا ہے:

> ''دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں ہے جو کل طور پر الگ تھلگ رہی ہو۔ دوسری قوموں یا گروہوں سے تھوڑا بہت سابقہ یا ربط ضرور رہا ہے، خواہ اس کا سبب کچھ بھی ہو اس لیے غیر شعوری طور پر نجی اور سماجی تقاضوں کے تحت کلموں کا لین دین ضرور ہوتا ہے۔''[۲]

کثیر اللسانی معاشروں میں مختلف زبانوں کے بولنے والوں کا مختلف ضروریات کے تحت آپس میں لین دین ہوتا ہے تو لسانی تفاعل ناگزیر ہو جاتا ہے۔یہ تفاعل کبھی مذہبی تقاضوں کے تحت ہوتا ہے تو کبھی سیاسی، کبھی معاشی ضروریات ایک دوسرے کے قریب لانے کا باعث بنتی ہیں تو کبھی تعلیمی و ثقافتی وجوہات۔وجہ کوئی بھی ہو،ان تمام پہلوؤں کے تحت آپس کے میل ملاپ کے ذریعے ایک زبان میں دوسری زبان یا زبانوں کے الفاظ باہم شیر و شکر ہو جاتے ہیں اور بعض دفعہ تو ان کے درمیان امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ الفاظ اس زبان کے اپنے ہیں یا کسی دوسری زبان سے لائے گئے ہیں۔لسانی عمل کے ذریعے الفاظ کا تبادل کسی ایک زبان میں کم ہو سکتا ہے اور کسی دوسری زبان میں زیادہ۔وہ الفاظ جو کسی زبان کے اپنے نہ ہوں بلکہ مختلف ضروریات یا مقاصد کے تحت دوسری زبان یا زبانوں سے لائے گئے ہوں یا خود بخود اس زبان کا حصہ بن گئے ہوں، دخیل یا مستعار الفاظ کہلاتے ہیں:

> ''مختلف لسانی گروہوں کے ربط ضبط کے نتیجے میں لسانی لین دین ہوتا رہتا ہے اور یہ سماجی تقاضوں کے تحت ضروری بھی ہے۔دوسری ثقافتوں سے استفادہ کیا جاتا ہے تو لسانی لین دین بھی ناگزیر ہو جاتا ہے۔''[۳]

باہمی ربط ضبط کے نتیجے میں مختلف قومیں ایک دوسرے کی زبان یا تو مکمل طور پر سیکھ لیتی ہیں یا پھر ایک زبان کے الفاظ دوسری زبان میں اس طرح شامل ہو جاتے ہیں کہ وہ اسی کا حصہ لگنے لگتے ہیں اور اس نئی زبان کے صرف و نحو کے مطابق استعمال ہونے لگتے ہیں:

''دخیل الفاظ کی تصریف اپنی زبان کے قاعدوں کی رو سے ہوتی ہے، ان کی اصل کے مطابق نہیں۔ اردو میں بہت سے دخیل الفاظ اردو قواعد کے ماتحت استعمال ہوتے ہیں۔''[۴]

ایک قوم یا گروہ کے دوسری قوم یا گروہ سے الفاظ کے لین دین کے اسباب و وجوہات کا جائزہ لیں تو ہمیں اس میں بہت سے محرکات کا سراغ ملتا ہے مثلاً جب ایک قوم دوسری قوم کے ساتھ مل جل کر رہتی ہے تو ان کے مابین ثقافتی عناصر کا تبادلہ ہونا ایک لازمی سی بات ہے کیونکہ کوئی بھی انسان کسی بھی معاشرے میں رہتا ہو، باہم مل جل کے رہنا اس کی فطرت بھی ہے اور ضرورت بھی۔ اسی ضرورت کے تحت مختلف ثقافتی پس منظر رکھنے والے افراد جب ایک ساتھ کسی علاقے میں رہتے ہیں یا کسی دفتر میں اکٹھے کام کرتے ہیں تو لازمی طور پر ایک دوسرے سے متاثر ہوتے بھی ہیں اور متاثر کرتے بھی ہیں۔ طاقتور یا فاتح قوم کی ثقافت کے اثرات کمزور یا مفتوح قوم پر عموماً زیادہ پڑتے ہیں۔ جب ایک قوم یا گروہ دوسری قوم یا گروہ کے ثقافتی اثرات قبول کرتی ہے تو بعض اوقات کم و بیش اسی کے رنگ میں رنگ جاتی ہے اور اس کی زبان کی ہر سطح کے الفاظ، محاورات اور اصطلاحات بھی لے لیتی ہے۔ ثقافتی ربط جتنا زیادہ ہوتا ہے اسی قدر دخیل یا مستعار الفاظ کی کثرت ہوتی ہے:

''زبانیں لسانی لین دین، تغیر و تبدل ہی کی بدولت ارتقا پاتی ہیں اس لیے ان کو بیرونی ثقافتوں یا زبانوں کے اثرات سے محفوظ رکھنے کی کوشش مفید نہیں بلکہ مضر ہوتی ہے۔''[۵]

اگر کوئی زبان کسی اعلیٰ درجے کی تہذیب و تمدن رکھنے والی قوم کی زبان ہے تو وہ اپنے ساتھ اس قوم کے جدید تخیلات اور اصول و مسائل بھی پردیس میں لے جائے گی۔ یونانی زبان نے عرب، ایران اور ہندوستان کے ساتھ یہی کیا۔ پھر لاطینی نے یورپ کی اکثر زبانوں کو اور عربی نے مصر، افریقہ، اسپین، ایران اور شام وغیرہ کی زبانوں کو اسی طرح مالامال کیا۔ لاطینی لفظ ''کیسر'' عربی اور پھر عربی سے ایرانی اور ہندوستانی میں ''قیصر'' کی شکل میں آیا یہی لفظ جرمن میں ''کائزر''، پولستانی میں ''کزار''، روسی میں زار اور انگریزی میں ''سیزر'' کی شکل میں مستعمل ہوا۔ صلیبی لڑائیوں کے زمانے میں لاتعداد عربی الفاظ یورپ میں پہنچ گئے۔ اسپین اور خاص کر

اندلس پر تو عرب صدیوں حکمران رہ چکے ہیں چنانچہ وہاں کی زبان میں قدم قدم پر عربوں کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔ ہندوستان کے دور دراز علاقوں میں جہاں فارسی بولنے والے اب بہت کم رہ گئے ہیں، آج بھی بعض فارسی الفاظ مل جاتے ہیں جو مسلمانوں کی حکومت کے ساتھ ساتھ وہاں پہنچ گئے تھے اور گو اب وہاں مسلمانوں کی حکومت باقی نہیں رہی مگر ان کے الفاظ موجود ہیں جو ماضی کی یاد دلاتے ہیں۔ یورپ میں ہر جگہ فرانسیسی الفاظ جواہر پاروں کی طرح بکھرے نظر آتے ہیں اور انگریزی میں تو آداب مجلس اور خورد و نوش وغیرہ کے اکثر الفاظ فرانس ہی کے مرہون منت ہیں۔ زبانوں میں اس قسم کی ممنوعیت کا تناسب عوام کے سیاسی اور اقتصادی حالات کی نوعیت کے مطابق کم یا زیادہ ہوتا ہے۔ عہد حاضر کی زبانوں میں انگریزی ایک ایسی زبان سمجھی جاتی ہے جس نے اس لین دین میں کمال حاصل کیا ہے۔ جہاں اس نے زیادہ سے زیادہ الفاظ دوسروں سے قرض لیے ہیں وہیں اپنے بھی سیکڑوں لفظ بکھیر دیے ہیں۔

زبانوں کے ایک دوسرے پر پڑنے والے اثرات کی ایک اور وجہ معاشی اسباب بھی ہیں۔ جو قومیں معاشی یا مادی اعتبار سے بہت ترقی یافتہ ہوتی ہیں وہ اپنا سامان تجارت دوسرے ممالک میں بھیجتی ہیں یوں اکثر چیزوں کے وہی نام پردیس میں بھی مشہور ہو جاتے ہیں جو ان کی جائے پیدائش یا جائے ساخت کی پیداوار ہوتے ہیں۔ صنعت و حرفت کے لحاظ سے وہ ممالک جن کا مال دوسرے ممالک میں زیادہ فروخت ہوتا ہے تو وہ مال اکیلا نہیں جاتا بلکہ مال کے ساتھ الفاظ بھی جاتے ہیں اور یہی الفاظ دوسری زبان یا زبانوں میں استعمال ہو کر ان زبانوں میں شامل ہو جاتے ہیں:

> ''چیزیں اپنے وطن سے باہر نکلتی ہیں تو تنہا نہیں آتیں۔ اپنا نام بھی سائے کی طرح اپنے ساتھ لے آتی ہیں اور اکثر دفعہ اپنے خریداروں کو اپنے وطن کا نام بھی استعمال کرنے پر مجبور کرتی ہیں۔''[۲]

لفظ تمبا کو امریکہ سے برآمد ہو کر یورپ اور ایشیا کے اکثر ملکوں میں اس چیز کے ساتھ ساتھ روشناس ہوتا گیا جس کو ہم تمباکو کہتے ہیں، لالٹین، بوٹ، پتلون، موٹر، سائیکل، ریل اور اس کے تمام متعلقات مثلاً

اسٹیشن، پلیٹ فارم، ٹکٹ، انجن اور اس طرح کے بے شمار الفاظ انہی مقامات سے ہندوستان میں آئے ہیں جہاں سے یہ نام رکھنے والی چیزیں یہاں داخل ہوئیں۔

دنیا کی تاریخ گواہ ہے کہ جب ایک قوم دوسری قوم کو فتح کرتی ہے تو نہ صرف اپنی فوج اس ملک میں تعینات کرتی ہے بلکہ اپنے ملک کے دیگر باشندوں کو بھی ساتھ لے آتی ہے۔ اگر فاتح قوم کا ارادہ دیر تک مفتوح قوم پر قابض رہنے کا ہو تو وہ مفتوح قوم سے میل جول کے ذریعے ان کی زبان اور تہذیب سے ربط بڑھانے کی کوشش کرتی ہے۔ اسی طرح مفتوح قوم کو بھی فاتح قوم کے مزاج کو سمجھنے کے لیے ان کی زبان سیکھنا پڑتی ہے۔ بعض اوقات تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک قوم دوسری قوم پر اس طرح غالب آجاتی ہے کہ دوسری قوم اپنی زبان، تہذیب و ثقافت تک بھول جاتی ہے اور فاتح قوم کی تہذیب کو اپنانے میں فخر محسوس کرتی ہے۔ جب ایک تہذیب دوسری تہذیب کا بھرپور اثر قبول کرتی ہے تو دوسری تہذیب کے بے شمار الفاظ پہلی تہذیب کی زبان میں داخل ہو جاتے ہیں:

> ''ایک طاقتور قوم کسی علاقے کو فتح کرتی ہے تو نہ صرف حاکم اور فوجی اپنے علاقے سے درآمد کرتی ہے بلکہ تاجر اور نوآباد کار بھی بلا لیتی ہے اور اگر یہ سیاسی تسلط سالہا سال تک رہتا ہے تو ملکی باشندے ان کی نقالی کرنے لگتے ہیں۔ یہ نقالی رہن سہن کی بھی ہوتی ہے اور زبان کی بھی۔''[۷]

مسلمانوں کی آمد سے قبل اردو ہندوستان میں ایک بولی کی حیثیت سے بولی جارہی تھی۔ مسلمانوں کی آمد سے اس میں عربی، فارسی اور ترکی کے الفاظ شامل ہونے لگے۔ جب مسلمانوں اقتدار سنبھالا تو فارسی کو سرکاری زبان کا درجہ دیا اور مقامی لوگوں سے میل جول پیدا کیا تاکہ اجنبیت کی دیواریں راستے میں حائل نہ ہوں۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے اردو کو جس میں منڈا، آریائی، سنسکرت، ہندی، دکنی، مرہٹی، گجراتی اور ان جیسی دوسری مقامی زبانوں کے الفاظ شامل تھے، ذریعہ اظہار کے طور پر اختیار کیا۔ مسلمانوں نے جب یہ زبان اختیار کی تو اس میں عربی، فارسی اور ترکی الفاظ کی آمیزش ہوگئی۔ اس طرح کثیر لسانی الفاظ کے ملنے سے زبان کی نئی شکل بننے لگی۔ رفتہ رفتہ اس میں ادب بھی تخلیق ہونے لگا:

''انسان کی سماجی ضرورتیں اسے محض پہلی یا مادری زبان کا محتاج نہیں بناتیں بلکہ کسی اور زبان یا زبانوں کو بھی وسیلہ بنانے پر مجبور کرتی ہیں۔''[۸]

رفتہ رفتہ مسلمان کمزور پڑنے لگے۔ ان کی باہمی چپقلش اور خانہ جنگیوں نے باہر کے لوگوں کو برصغیر کا رخ دکھایا۔ لیکن ایک لمحے کو ٹھہر کر ناقدانہ جائزہ لیا جائے تو مشرق سے متعلق اہل مغرب کے ذہنوں میں پائے جانے والے عجیب و غریب، مافوق الفطرت اور غیر حقیقی تصورات نے (جن کا تفصیلی ذکر ایڈورڈ سعید نے اپنی کتاب ''شرق شناسی'' میں کیا ہے) نے اقوام مغرب کو مشرق کا راستہ دکھایا۔ مشرق سے متعلق ایک عام خیال یہ پایا جاتا تھا کہ مشرق ایک ایسا جغرافیائی خطہ ہے جہاں کاشتکاری اور فصل برداری کی جا سکتی ہے۔ جہاں کے لوگ مغرب کے مقابلے میں کمزور، منطق سے عاری، نسوانی عادات کے حامل اور جنسی توجہ سے لبریز جذبات رکھتے ہیں، سست اور غافل ہیں۔ نیز یہ کہ مشرق، مغرب کی بڑی بڑی طاقتوں کو دعوت دیتا ہے کہ وہ آگے بڑھ کر انہیں اپنی نوآبادیات بنالیں۔ یہی وجہ ہے کہ :۔

''برطانیہ کو مصر، میسوپوٹامیہ (موجودہ عراق)، خلیج فارس، بحیرۂ احمر، نہر سویز کے علاوہ بحیرۂ روم اور ہندوستان کے درمیان قبائلی سرداروں کے ساتھ صرف کمزور سے کاغذی معاہدوں کی بنا پر ان علاقوں میں مکمل اختیار حاصل تھا۔''[۹]

مغرب کی بڑی بڑی طاقتیں مثلاً برطانیہ اور فرانس اپنے باہمی اختلافات کے باوجود اس بات پر متفق تھیں کہ مشرق کی قسمت پر ان کا حق ہے۔ ایڈورڈ سعید اپنی کتاب شرق شناسی میں نپولین کے حوالے سے لکھتا ہے کہ :۔

''جب نپولین جوان تھا اس وقت سے اس کے لیے مشرق میں کشش تھی۔۔۔ نپولین سکندر اعظم کے مشرق کے خیالوں میں کھویا رہتا تھا۔ اس طرح نئے سکندر کے روپ میں مشرق کو دوبارہ فتح کرنے اور۔۔۔ نئی اسلامی نوآبادی حاصل کرنے کے خیال نے اسے مصر پر حملے کے لیے آمادہ کیا۔''[۱۰]

ہندوستان کی اندرونی خانہ جنگیوں، کمزوریوں اور مغرب میں مشرق سے متعلق پائے جانے والے اس طرح کے بہت سے خیالات سے ترغیب پاکر پہلے پہل پرتگالی قوم تجارت کے بہانے ہندوستان میں وارد ہوئی۔

۱۴۹۸ء میں پرتگالی جہازراں ''واسکوڈے گاما'' اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ہندوستان کے مغربی ساحل کالی کٹ (کلکتہ) پہنچا۔ اس کے بعد پرتگالیوں کی آمد کا مستقل سلسلہ شروع ہو گیا۔ رفتہ رفتہ انہوں نے کوچین، کنانور، گوا، ہرمز، اور دمن پر قبضہ کر کے تجارتی کوٹھیاں اور قلعے بنائے، جائیدادیں خریدیں، کاشتکاروں سے میل جول پیدا کیا، اپنے مذہب کی تبلیغ کی، سکول اور ہسپتال تعمیر کیے، حتیٰ کہ مقامی زبان بھی استعمال کی۔ جب اس قسم کے تفاعلات ہوئے تو ہندوستان کی سیاسی، معاشی اور مجلسی زندگی بہت متاثر ہوئی۔ جگہ جگہ یورپی طرز کے مکان بننے لگے۔ کئی نئے شہر آباد ہوئے اور یوں ڈیڑھ صدی کے دوران پرتگالی زبان مقامی سطح پر بھی بولی جانے لگی:

> ''ان کی زبان ہندوستان کے ایک بڑے حصے کی زبان عام ہو گئی جو محض ہندوستان اور اہل یورپ کے درمیان تبادلہ خیالات کا ذریعہ ہی نہیں تھی بلکہ خود یورپ کے سوداگر بھی آپس میں اس زبان میں گفتگو کرتے تھے۔''[۱۱]

پرتگال کی گرفت کمزور پڑتی دیکھ کر دیگر اقوام بھی ہندوستان میں تجارت کی غرض سے آنے لگیں۔ سترہویں صدی کے شروع میں ہی ایسٹ انڈیا کمپنی تجارت کی غرض سے ہندوستان میں داخل ہوئی۔ کپتان ہاکنس نے جہانگیر کی اجازت سے سورت کے مقام پر تجارتی کوٹھی بنوائی۔ اس کے بعد ۱۶۱۵ء میں سرٹامس رو نے جہانگیر سے خوش گوار تعلقات قائم کیے۔ اس کے نتیجے میں انگریزوں کی جابجا قلعہ بند کوٹھیاں قائم ہوئیں۔ اورنگ زیب کی زندگی میں تو کمپنی کو اپنے مقبوضات بڑھانے میں مشکل پیش آتی رہی لیکن ۱۷۰۷ء میں اس کے انتقال کے بعد کمپنی کو اپنی سازشوں اور چالبازیوں کے سہارے مختلف علاقوں پر قبضہ کرنے کا موقع مل گیا۔ ۱۷۵۷ء میں جنگ پلاسی کی فتح کے بعد وہ تجارت کے ساتھ ساتھ سیاست میں بھی اپنا کردار ادا کرنے لگی۔ رفتہ رفتہ انگریزوں کو ہندوستانی معاشرے میں اپنی جڑیں مضبوط کرنے کا موقع ملا اور وہ شہروں کے درمیان آباد ہو کر مقامی لوگوں سے گھل مل گئے:

> ''وہ ہندوستان میں ڈیڑھ سو سال کے قیام کی وجہ سے بدیسی نہ رہے تھے بلکہ مثل مغلوں اور افغانوں کے دیسی ہو گئے تھے۔ انہوں نے بھی ہندوستانی معاشرت اختیار کر لی تھی۔ شہروں کی آبادیوں کے درمیان ہندوستانیوں سے گھل مل کے رہتے تھے۔ حتیٰ کہ ان کے مشاعروں

میں شریک ہو کر ہندوستانی زبان میں غزلیں پڑھتے تھے اور ہندوستانی شعرا سے اپنے کلام کی داد پاتے تھے۔ غرض کہ وہ اس قدر مل جل گئے تھے کہ خانہ جنگیوں میں ہندوستان کے لوگ ان سے بے تکلف مدد لیتے اور ان کی مدد کرتے تھے۔''[۱۲]

جب ہندوستان میں انگریز کو سیاسی اور تجارتی استحکام ملا تو وہ پورے ہندوستان پر قبضہ کرنے کے منصوبے بنانے لگے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے انہوں نے ہر طرح کے حربے استعمال کیے۔ لین دین کے میدان میں اپنی خاص تکنیک کے تحت چھاؤنیوں میں تجارتی بازار بنائے جس سے ارد گرد کے مقامی بازار بہت متاثر ہوئے اور مقامی بیوپاری اپنی منڈیوں کو چھوڑ کر انگریزوں کی منڈیوں میں جانے پر مجبور ہو گئے۔ انگریز نے مقامی کاشتکاروں، صنعتکاروں اور ہنر مندوں کو اپنے تجارتی مقاصد کے لیے استعمال کیا۔ اتنے بڑے ملک کے نظم و نسق کو احسن طریقے سے چلانے کے لیے انگریز نے محسوس کیا کہ مقامی لوگوں کی زبان کو ایک ایسے پل کی حیثیت سے استعمال کیا جائے جو دونوں کے درمیان رابطے کا کام دے سکے۔ اس مقصد کے لیے اردو زبان کو منتخب کیا گیا جو اس وقت پورے ہندوستان میں سمجھی اور بولی جارہی تھی۔ انگریز کے یہاں طویل قیام کو یقینی بنانے کے لیے ضروری تھا کہ یہاں کے لوگوں کے طرز رہن سہن، بود و باش، رسوم و رواج کو سمجھا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے لارڈ ویلزلی نے ۱۸۰۰ء کلکتہ میں میں فورٹ ولیم کالج اور ۱۸۰۵ میں لندن سے بیس میل دور ہیلی بری کالج قائم کیا۔ ان دونوں کالجوں میں کمپنی کے ملازمین کو دوسرے مضامین کے علاوہ اردو کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس قلیل مدتی کام کے لیے نئے سرے سے کتابیں لکھوانا ممکن نہ تھا لہٰذا اردو، ہندی، فارسی، سنسکرت میں موجود داستانوی ادب کو بالخصوص اور مذہبی و اخلاقی ادب کو بالعموم اردو میں تراجم کی شکل میں منتقل کیا گیا۔ اور ایسا کرنے کی وجہ یہ تھی کہ کہانیوں کی دنیا اتنی دلچسپ ہوتی ہے کہ نئی زبان سیکھنے والے غیر محسوس انداز میں زبان سیکھتے جاتے ہیں:

''کمپنی تجارتی و حکومتی اغراض کے لیے اپنے یورپی ملازمین کو ہندوستان کی زبان، رسم و رواج اور طور طریقوں سے واقف کرانا پڑا۔ اس ضرورت کے مد نظر کمپنی کے نظماء متعدد طریقوں پر وقتاً فوقتاً اپنے انگریز ملازمین کو یہاں کی دیسی زبانیں سکھانے کا انتظام کرتے رہے اور جوں جوں ان کا دائرہ عمل بڑھتا گیا اس میں بھی ترقی و اضافہ کرنا پڑا۔''[۱۳]

اگرچہ انگریز حکام کے پیش نظر نہ تواردو زبان کی کم مائیگی تھی نہ ہی اس کی ترقی مقصود تھی بلکہ ان کا مقصد سراسر سیاسی تھا۔ یعنی نو وارد انگریز افسروں کو ''ہندوستانی'' سے بہرہ ور کر کے مقامی باشندوں اور ان کے درمیان اختلافات کی اس خلیج کو پاٹنا تھا جو اُن کی ہوس ملک گیری اور تسخیر سلطنت کے ارادوں میں رکاوٹ بنی ہوئی تھی لیکن اسے اردو زبان کی خوش قسمتی کہیے کہ فورٹ ولیم کالج اردو زبان کا دامن وسیع کرنے کا باعث بن گیا۔ اردو زبان انگریزوں کی ضرورت اور بعد کی سیاسی تبدیلیوں کے نتیجے میں بہت پھلی پھولی اور اپنے فطری مزاج کی بدولت اختلافات کی پروانہ کرتے ہوئے آگے بڑھتی گئی۔ برصغیر پاک وہند میں کوئی اور زبان ایسی نہ تھی جو اس مقبول ترین زبان کی راہ روکتی یا اس کی قائم مقام بن سکتی۔ نوزائیدہ ہندی میں اتنی سکت نہ تھی۔ لہٰذا انگریزوں کو اپنی مقصد براری کے لیے اردو ہی کا دامن تھامنا پڑا۔

۱۸۵۷ء کے بعد چونکہ پورا ہندوستان انگریز کے دست تصرف میں آگیا تھا لہٰذا مشرقی تہذیب رفتہ رفتہ طبعی موت مرنے لگی اور اس کی جگہ مغربی تہذیب کا بول بالا ہونے لگا۔ گو انگریزی زبان و تہذیب کا مخالف طبقہ ہندوستان میں موجود تھا مگر ایک جماعت ایسی بھی پیدا ہو گئی تھی جو قدیم وضع کی پابندیوں اور جکڑ بندیوں سے آزاد ہونے کی کوشش کرنے لگی تھی۔ دراصل بات یہ ہے کہ جب ایک قوم دوسری قوم پر غالب آجاتی ہے تو مغلوب قوم غالب قوم کی تہذیب و ثقافت اور زبان کو اپنانے کی ضرور کوشش کرتی ہے۔ ہندوستان میں بھی یہی کچھ ہو رہا تھا۔ انگریزی تعلیم سرکاری ملازمت کا ذریعہ اور زینہ تھی۔ انگریزی تعلیم اور فیشن کے پھیل جانے سے اعلیٰ طبقوں کے خیالات اور پسند میں نمایاں تبدیلیاں پیدا ہونے لگیں۔ مذہبی بحث مباحثے کا رواج بھی رجحان پکڑنے لگا۔ یہاں تک کہ ہر ایک معاملے میں انگریز کی تقلید کی طرف لوگ روز بروز جھک رہے تھے۔ اس عہد میں انگریزوں کی مخالفت گھاٹے کا سودا تھی جبکہ اس سے دوستی کامیابیوں کی ضمانت تھی۔ اسی باعث ہندوستان کے اکثر لوگ انگریز کے خیر خواہ بننے لگے۔ شلوار قمیض کی جگہ پینٹ شرٹ اور پگڑی کی جگہ ہیٹ سجانے لگے۔ روٹی کی جگہ ڈبل روٹی، حقے کی جگہ چرٹ اور پان کی جگہ چائے نوش کرنے لگے۔ غرضیکہ پورے ماحول پر مغربیت چھاگئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان تمام تہذیبی عوامل سے متعلقہ الفاظ اردو زبان میں داخل ہونے لگے:

''حاکم قومیں اپنی زبان اور اپنا کلچر ساتھ لاتی ہیں اور محکوم قومیں، جن کی تہذیبی و تخلیقی قوتیں مردہ ہو جاتی ہیں، اس زبان اور کلچر سے اپنی زندگی میں نئے معنی پیدا کر کے نئے شعور اور احساس کو جنم دیتی ہیں۔''[۱۴]

ایسا نہیں کہ صرف اہل ہند نے ہی حاکم قوم کی زبان اور تہذیب سے اثرات قبول کیے بلکہ خود انگریزوں نے بھی اردو زبان سیکھی۔ اردو زبان کی لغات لکھیں۔ صرف و نحو کے قواعد پر کتابیں تالیف کیں۔ قانون کی کتابیں اردو میں تحریر کی گئیں۔ بائبل کے اردو میں تراجم کیے گئے۔ اردو رسائل اور اخبارات شائع کیے۔ کمپنی کے ملازمین کے لیے اردو زبان سیکھنا لازمی قرار دیا گیا۔ اردو زبان کو سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا۔ جارج پیش شورؔ، الگزینڈر ہیڈلے آزادؔ جیسے انگریزوں نے اردو تخلص کے ساتھ شاعری کی۔ عدالتی کاروائیاں اردو میں تحریر کی جانے لگیں:

''چونکہ عدالتی زبان اردو ہو گئی تھی اس لیے شمالی ہند کی کچہریوں کی کاروائیاں اردو میں ہوتی تھیں۔ خود انگریز حکام تجویزیں اور فیصلے اردو میں لکھتے لکھواتے تھے۔''[۱۵]

یہی نہیں ملکہ انگلستان نے بھی اردو زبان سیکھی اور اس کے اردو دستخط بھی شائع ہوئے:

''ملکہ وکٹوریا نے منشی عبدالکریم کو آگرہ سے تعلیم حاصل کرنے کے لیے لندن بلایا اور اردو لکھنے پڑھنے لگیں۔''[۱۶]

اعلیٰ انگریزی حکام نے درباروں میں اردو زبان میں تقریریں کیں:

''جنوری ۱۸۶۵ء کو پنجاب کے لفٹنٹ گورنر نے لاہور میں اپنی روانگی سے قبل ایک دربار منعقد کیا۔ اس موقع پر انگریزی میں نہیں بلکہ ہندوستان (اردو] میں حاضرین جلسہ کو مخاطب کیا۔''[۱۷]

دوسری طرف دیکھا جائے تو خود اردو زبان نے بھی انگریزی زبان سے خوب استفادہ حاصل کیا۔ سائنس کی اعلیٰ تعلیم اور دارالتراجم کے تحت ہزاروں انگریزی الفاظ اردو میں شامل کیے۔ ادبی سطح پر بھی انگریزی کے نئے موضوعات، اسلوب بیان، کہاوتیں اور محاورے اردو میں ڈھالے گئے۔ انگریزی رموز او قاف کو اردو میں استعمال کیا جانے لگا۔ مغربی علوم و فنون کے اردو میں تراجم کے ذریعے اردو زبان کے دامن کو وسعت دی

گئی۔ مختصر افسانہ، ناول، ڈرامہ جیسی اصناف انگریزی ادب کی بدولت اردو میں آئیں۔ نظم کی ظاہری صورتوں میں اضافہ کیا گیا اور انگریزی کی تقلید میں مختلف موضوعات اور مناظرِ فطرت کو شاعری میں جگہ دی جانے لگی۔ ہندوستان کے شاعروں میں انشاء اللہ خان انشاء پہلے شاعر تھے کہ جنہوں نے اپنی شاعری میں بالعموم اور قصیدے میں بالخصوص انگریزی الفاظ کا استعمال کیا۔ انگلستان کے بادشاہ جارج سوم جب دماغی عارضے سے صحت یاب ہوئے تو اس خوشی میں ایک تقریب ہوئی:

''اس تقریب میں انشاء نے ''قصیدہ در تہنیت جشن'' پیش کیا۔''[۱۸]

جس میں پوڈر، کوچ، گلاس، بوتل، پلٹن، اردلی، بگل وغیرہ کی شکل میں بہت سے انگریزی الفاظ استعمال کیے۔ اس سارے عرصے میں بے شمار انگریزی لفظ اردو میں شامل ہوئے جن میں سے بہت سوں کو ہندوستانی لب ولہجے کے مطابق ڈھال لیا گیا مثلاً ماچس، لالٹین، کرنیل، جرنیل، رپٹ، سنتری، لاٹ صاحب وغیرہ۔ اس دولسانی عمل کے نتیجے میں اردو زبان کا دامن بہت وسیع ہوتا گیا۔

اردو زبان نے انگریزی ادب، تہذیب، ثقافت، معاشرت غرضیکہ ہر شعبۂ زندگی سے اثر قبول کیا۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ برصغیر پاک وہند ایک طویل عرصہ تک انگریز کی نوآبادی رہا ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے کہ فاتح قوم مفتوح قوم پر ہر طرح سے اثرانداز ہوتی ہے۔ یہ اثر پذیری کہیں کم اور کہیں زیادہ ہو سکتی ہے۔ انگریزی زبان کے معاملے میں بھی کچھ یہی صورت حال نظر آتی ہے۔ انگریز جب برصغیر آئے تو وہ صرف اپنی زبان ہی نہیں لائے بلکہ متعلقات زندگی کے مختلف شعبوں مثلاً لباس، غذا، تفریح، علوم، فنون، موسیقی، ادب، سیاست، صحافت، ٹیکنالوجی، ذرائع آمد ورفت، سائنس، معاش، معاشرت اور روزمرہ زندگی کے بے شمار الفاظ بھی اپنے ساتھ لائے۔ جب انہوں نے مقامی لوگوں کے ساتھ میل ملاپ کیا تو یہ لفظ رفتہ رفتہ اردو میں داخل ہوتے گئے۔

اردو زبان سے کبھی تو اصلاح زبان کی صورت میں ناسخ اور شاہ حاتم جیسے لوگوں نے شعوری کوشش کر کے ہندی اور سنسکرت کے الفاظ کو نکال باہر کیا اور زبان کو مفرّس و معرّب بنانے کی کوشش کی تو کبھی سرسید اور ان کے رفقاء نے شعوری کوشش کر کے انگریزی زبان کے الفاظ کو اردو میں شامل کیا۔ یہاں تک کہ سرسید

نے تو ایسے الفاظ بھی اردو میں شامل کیے جن کے مترادف اردو میں موجود تھے مثلاً سویلائزیشن، اسپیچ وغیرہ جس سے ان کا مقصود اردو زبان کا دامن وسیع کرنا تھا۔

اردو زبان اخذ و اشتقاق کے معاملے میں بڑی لچک رکھتی ہے۔ دوسری زبانوں کے الفاظ کو خود میں سمو لینے کی اسی خاصیت کی وجہ سے اس کا دامن وسیع ہے۔ اردو نے اپنے لسانی مزاج کے مطابق انگریزی زبان کے الفاظ کو نہ صرف اپنے دامن میں سمیٹا ہے بلکہ اس میں بہت سے تصرفات بھی کیے ہیں۔ کہیں صوتی و املائی اعتبار سے تو کہیں سبقلاحی تصریف کے ذریعے۔ کہیں ان الفاظ کو محاورات کی صورت میں اپنے اندر سمویا تو کہیں افعالی و مرکباتی تصریفات کیں۔ میرے اس تحقیقی مقالے کا مقصد ہی اردو زبان کی اس انجذابی صلاحیت کو سامنے لانا ہے جس کے تحت اس نے انگریزی کے مستعار الفاظ کو اس طرح خود میں جذب کیا ہے کہ بعض جگہوں پر تو یہ گمان تک نہیں گزرتا کہ یہ لفظ اردو زبان کا اپنا نہیں بلکہ انگریزی سے مستعار لیا گیا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ خلیل صدیقی، زبان کیا ہے (ملتان: بیکن بکس، ۱۹۸۹ء)، ص۵۷۔

۲۔ خلیل صدیقی، زبان کا ارتقا (کوئٹہ: زمرد پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء)، ص۱۷۳۔

۳۔ خلیل صدیقی، زبان کیا ہے، ص۶۲۔

۴۔ ایضاً، ص۲۔

۵۔ خلیل صدیقی، زبان کا ارتقا، ص۱۴۲۔

۶۔ محی الدین قادری زور، ہندوستانی لسانیات (لاہور: مکتبہ معین الادب، ۱۹۶۱ء)، ص۵۴۔

۷۔ خلیل صدیقی، زبان کا ارتقا، ص۱۷۱۔

۸۔ خلیل صدیقی، زبان کیا ہے، ص۷۶۔

۹۔ ایڈورڈ سعید، شرق شناسی، مترجم: محمد عباس (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۵ء)، ص۲۳۹۔

۱۰۔ ایضاً، ص۹۳۔

۱۱۔ رام بابو سکسینہ، تاریخ ادب اُردو، مترجم: مرزا محمد عسکری (لاہور: علمی کتاب خانہ، اردو بازار، ۱۹۸۲ء)، ص۵۔

۱۲۔ طفیل احمد منگلوروی، مسلمانوں کا روشن مستقبل (لاہور: حمادالکتبی شیش محل روڈ، سن ندارد)، ص۴۷۔

۱۳۔ سید محمد، مولوی، ارباب نثر اُردو (لاہور: مکتبہ معین الادب، ۱۹۵۰ء)، ص۹: ۱۰۔

۱۴۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اُردو (جلداول)(لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۷ء)، ص۲۔

۱۵۔ حامد حسن قادری، داستان تاریخ اُردو (کراچی: اردو اکیڈمی، ۱۹۶۶ء)، ص۷۹۔

۱۶۔ ایضاً، ص۶۹۔

۱۷۔ ایضاً، ص۶۸۔

۱۸۔ عبداللہ یوسف علی، انگریزی عہد میں ہندوستانی تمدن کی تاریخ (لاہور: دوست ایسوسی ایٹس، ۱۹۹۴ء)، ص۱۵۸۔